مثنوی سحرالبیان

مثنوی سحرالبیان جس نے قصۂ بے نظیر و بدر منیر کے نام سے بھی شہرت پائی، میر حسن کا شہکار ہے۔ میر شیر علی افسوس نے اس کے دیباچے میں بالکل سچ لکھا ہے کہ "مثنوی سحرالبیان اسم بامسمیٰ ہے کیونکہ اس کا ہر شعر اہلِ مذاق کے دلوں کو بھانے کو موہنی منتر ہے اور ہر داستان اس کی سحر سامری کا ایک دفتر کیونکہ فصاحت اور بلاغت کا اس میں ایک دریا بہا ہے"۔ یہی بات مصنف نے فخر کے ساتھ مثنوی کے ابتدائی شعروں میں کہی ہے ــــــ

ذرا منصفو! داد کی ہے یہ جا — کہ دریا سخن کا دیا ہے بہا

زبس عمر کی اس کہانی میں صرف — تب ایسے یہ موتی سے نکلے ہیں حرف

نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں — نہیں مثنوی ہے یہ سحرالبیاں

میر حسن کا دعوا درست ہے۔ محمد حسین آزاد نے میر حسن کی جادو بیانی کا اعتراف کرتے ہوئے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ "زمانے نے ان کی سحرالبیانی پر تمام تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔"

مثنوی کا قصّہ: اس مثنوی میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدرِ منیر کے عشق کی داستان بیان ہوئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ تھا جس کے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ نجومیوں نے حساب لگا کے یہ خوش خبری سنائی کہ بادشاہ کے چندرما جیسا بیٹا ہوگا مگر بارہویں برس اسے خطرہ ہے۔ نجومیوں کی بات سچ نکلی۔ بادشاہ نے بیٹے کو دنیا کی نظروں سے چھپا کے رکھا مگر حساب میں بھول چوک ہوگئی۔ بارہ برس کی مدت پوری ہونے سے پہلے شہزادے کو کھلی چھت پر سونے کی اجازت دے دی گئی۔ ایک پری ماہ رخ کی شہزادہ بے نظیر پر نظر پڑ گئی۔ وہ شہزادے پر فریفتہ ہوگئی اور اسے لے اڑی۔

شہزادے کا پری سے دل نہ مل سکا۔ پری نے اسے دل بہلانے کے لیے ایک کل کا گھوڑا دیا۔ اتفاق

Scanned by TapScanner

سے یہ گھوڑا ایک شام شہزادی بدر منیر کے باغ میں اتر گیا۔ شہزادہ شہزادی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دل دے بیٹھے۔ وزیر زادی نجم النسا کی تدبیر سے دونوں کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ایک دیو نے ماہ رخ پری کو یہ خبر جا سنائی۔ اس نے شہزادے کو ایک کنویں میں قید کر دیا۔ آخر نجم النسا جوگن بن کے شہزادے کی تلاش میں نکلی۔ جنوں کے بادشاہ کے بیٹے فیروز شاہ کی مدد سے اس نے شہزادے کو ڈھونڈ نکالا۔ بے نظیر اور بدر منیر زندگی بھر کے رشتے کی ڈور میں بندھ گئے۔ نجم النسا کی شادی فیروز شاہ سے ہوگئی۔ یوں یہ کہانی اختتام کو پہنچی۔

مصنف کا دعوا ہے کہ مثنوی کی کہانی ان کی طبع زاد ہے یعنی یہ قصہ ان کا اپنا وضع کیا ہوا (بنایا ہوا) ہے لیکن یہ درست نہیں۔ قصے میں جتنی باتیں ہیں وہ الگ الگ دوسرے قصوں، کہانیوں، داستانوں میں موجود ہیں۔ مصنف نے انھیں جوڑ کر ایک نئی داستان تیار کر دی لیکن اس سے نہ میر حسن کا رتبہ گھٹتا ہے نہ اس مثنوی کا۔ اس کی اصل خوبی پیشکش میں ہے۔

تصویر کشی : سحر البیان کا ایک بہت بڑا کمال اس کی تصویر کشی ہے۔ میر حسن نے جس منظر اور جس حالت کا جہاں بھی نقشہ کھینچا ہے تصویر کشی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مولانا حالی مثنوی سحر البیان کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "غرض کہ جو کچھ اس مثنوی میں بیان کیا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے تصویر کھینچ دی ہے۔ اور مسلمانوں کے اخیر دور میں سلاطین و امرا کے یہاں جو حالتیں ایسے موقعوں پر گزرتی تھیں اور جو جو معاملات پیش آتے تھے بعینہٖ ان کا چربہ اتار دیا ہے۔" میر حسن نے جس منظر کی تصویر کھینچی ہے اس میں ایسی مہارت کا ثبوت دیا ہے کہ پورا منظر ہماری آنکھوں کے آگے ابھر آتا ہے۔ ایک منظر دیکھیے ـــــ

وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر — وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اجلا سا میداں چمکتی سی ریت — اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے — خس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور — گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

ایک موقع پر شہزادی کی تصویر کھینچی ہے اور بہت جیتی جاگتی تصویر۔ بہت اندیشہ تھا کہ دوسرے مثنوی نگاروں کی طرح یہاں عریانی پیدا ہو جائے گی لیکن میر حسن عریانی اور فحش نگاری کی دلدل

میں نہیں پھنسنے اور ایک صاف ستھری اور بالکل فطری تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے ـــــ

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے — بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے — لجائے ہوئے، شرم کھائے ہوئے
پسینا پسینا ہوا سب بدن — کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن

میر حسن جب کوئی تصویر کھینچتے ہیں تو جزئیات نگاری کی طرف خاص دھیان دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کسی منظر یا کسی حالت کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی چیز معمولی سے معمولی تفصیل نظر انداز نہیں ہوتی اور مکمل تصویر اتر آتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے زمانے کا لکھنؤ اور اس عہد کے ماحول، رہن سہن اور معاشرت کی تصویریں ہمارے ادب میں محفوظ ہوگئیں۔

معاشرت کی مرقع کشی : مثنوی سحر البیان کے ذریعے ہم لکھنؤ کی جی بھر کے سیر کر لیتے ہیں۔ اس زمانے کی پوری معاشرت، پورا رہن سہن ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی حکومت کے دوران لکھنؤ کیسا تھا۔ اس میں کیا خوبیاں اور کیا خرابیاں تھیں یہ سب ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ سارے ہندوستان میں اودھ ایک ایسی جگہ تھی جہاں انگریزوں سے مصالحت کے سبب امن و عافیت نصیب تھی۔ خوش حالی کا دور دورہ تھا لیکن یہ آسودگی اپنے ساتھ بہت سے عیب بھی لے کر آئی۔ ہر طرف عیاشی، مے نوشی اور لہو و لعب کا دور دورہ ہوگیا۔ طوائفوں کی گرم بازاری ہوگئی۔ دولت کی فراوانی نے امرا کو بے فکر، لاابالی اور کاہل بنا دیا۔ غور و فکر کی صلاحیت جاتی رہی۔ امیروں کی دیکھا دیکھی عوام کا بھی یہی حال ہوا۔ وہ بھی نکمے اور ناکارہ ہوگئے۔ رہن سہن پر تصنع اور بناوٹ کا ملمع چڑھ گیا۔ اہلِ لکھنؤ سیدھے سادے انداز میں بات کرنا بھول گئے۔ لچھے دار فقرے، ضلع جگت، پھبتی، ٹھٹھول ان کے مزاج کا حصہ بن گئے۔ ہر بات میں ظاہر داری کا انداز پیدا ہوگیا۔

سحر البیان میں جو ہم بادشاہ کو بیوقوف، قوتِ عمل سے محروم، توہم پرست پاتے ہیں اس کا سبب یہی ماحول ہے۔ شہزادیاں اپنے باغوں میں رنگ رلیاں مناتی اور عشق لڑاتی نظر آتی ہیں۔ شہزادہ بے نظیر عاشق نہیں، شہزادی کا معشوق نظر آتا ہے۔ ایک زوال آمادہ ماحول میں پلا ہوا شہزادہ بزدل، بے عمل، کم عقل ہونے کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ پری کی قید میں اس کا یہ حال ہے ـــــ

کبھی اشک آنکھوں میں بھر لائے وہ　　کبھی سانس لے کر کہے "ہائے" وہ
وہ محلوں کی چہلیں، وہ گھر کا سماں　　رہے روبرو دھیان میں ہر زماں
وہ شفقت جو ماں باپ کی یاد آئے　　تو راتوں کو رو رو کے دریا بہائے
کبھی اپنی تنہائی پر غم کرے　　کبھی اپنے اوپر دعا دم کرے

لکھنؤ کی تقریبات اور جشن، بچے کی پیدائش پر خوشیاں منانا، مسجدوں میں دیے روشن کرنا، بھانڈوں کی نقل، قوالوں کی مبارک سلامت، انعامات و خلعت کی تقسیم، خیر خیرات، نذر نیاز، منتیں ماننا، چھٹی، سالگرہ، دودھ بڑھائی کی رسم، اور مختلف رسمیں، اس زمانے کے پہننے، اس زمانے کے لوگوں کا رہن سہن، عوام کی زندگی، دربار کی زندگی ــــ سبھی کچھ بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جزئیات نگاری میں میر حسن کو کمال حاصل ہے۔ وہ اس طرح ہر چیز کی تفصیل پیش کرتے ہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور معمولی سے معمولی حصہ کبھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ مثلاً موسیقی کے آلات کا ذکر کرتے ہیں تو سارے ساز گنا دیتے ہیں جیسے طبلہ، مردنگ، طنبورہ، چنگ، رباب، ستار، قرنا، جھانجھ ــ ہر راگ اپنے صحیح وقت پر سنائی دیتا ہے، تال اور سُر کی پوری کیفیت پیش کی جاتی ہے، زیر و بم کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ زیورات اور لباس کا ذکر ہوتا ہے تو اس کا حق ادا کر دیا جاتا ہے۔ دعوت کا حال بیان ہوتا ہے تو کھانوں کی تمام اقسام گنا دی جاتی ہیں۔

غرض یہ کہ مثنوی سحر البیان میں میر حسن کے عہد کا لکھنؤ ہمارے پیش نظر ہو جاتا ہے۔ سلطنت کی شان و شوکت، تخت گاہ کی رونق، چہل پہل، ایک خوش حال سوسائٹی کی بے فکری، خوش باشی اور ناچ رنگ ــ سبھی کچھ اس مثنوی میں نظر آ جاتا ہے۔ یہ کہیے کہ مثنوی سحر البیان ایک آرٹ گیلری ہے جس میں لکھنؤ اور لکھنؤ کی معاشرت کی بیسیوں تصویریں آویزاں ہیں ــ جیتی جاگتی اور دل آویز!

کردار نگاری: مثنوی سحر البیان میں کردار نگاری کے بہت اعلا نمونے تو نظر نہیں آتے۔ پھر بھی اس میں کردار نگاری کے دو ایک دلکش نمونے نظر آ جاتے ہیں۔ مثنوی میں مرکزی کردار چار ہیں ــ شہزادہ بے نظیر، شہزادی بدر منیر، ماہ رخ پری اور وزیر زادی نجم النسا۔

شہزادہ بے نظیر اپنے عہد کے شہزادوں اور امیر زادوں کا سچا نمائندہ ہے ــ کم عقل، بے عمل

اور بزدل۔ اس کا نام بے نظیر رکھا ہی اس لیے گیا ہے کہ مصنف کی دانست میں وہ خوبیوں کا ایسا مجموعہ ہے کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ شروع ہی میں اس کا تعارف یہ کہہ کر کرایا جاتا ہے کہ ــــ

گیا نام پر اپنے وہ دل پذیر　　ہر اک فن میں سچ مچ ہوا بے نظیر

لیکن پورے قصے میں کہیں بھی اس کے کسی فن کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ وہ مصیبت میں پھنس کر رہ جاتا ہے، اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی تدبیر نہیں کرتا۔ ہر قدم پر دوسروں کا محتاج نظر آتا ہے۔ شہزادی بدر منیر حسنِ صورت میں لاجواب تو ہو سکتی ہے۔ شاید اسے چاند کا ٹکڑا کہنا بجا ہو مگر اعلا اوصاف سے محروم ہے، ماں باپ کی نگاہوں سے دور، ان سے چھپ چھپ کر وہ باغ میں عشق لڑاتی ہے اور دوسروں کی صلاح کی محتاج نظر آتی ہے۔ البتہ جب اس کے رشک و رقابت کے جذبات ابھرتے ہیں تو وہ ایک جاندار عورت کے روپ میں ابھرتی ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ ایک پری سے راہ و رسم بڑھا رہا ہے تو جل کر شہزادے سے کہتی ہے ــــ

مرو تم پری پر، وہ تم پر مرے　　بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے

شہزادے کی جدائی میں اس کا جو حال ہوتا ہے اس میں بھی صداقت نظر آتی ہے ــــ

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی　　درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی　　بہانے سے جا جا کے رونے لگی
تپِ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ　　اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسنا، نہ وہ بولنا　　نہ کھانا، نہ پینا، نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے　　محبت میں دن رات گھٹنا اسے

ماہ رخ ایک پری ہے جو ایک آدم زاد یعنی شہزادہ بے نظیر پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ وہ قوتِ عمل بھی رکھتی ہے اور شہزادے کو اڑا لے جاتی ہے۔ جب اسے شہزادے اور شہزادی کی محبت کا حال معلوم ہوتا ہے تو آتشِ رشک سے جل جاتی ہے اور اس کا رویہ بالکل ایک عام عورت کا سا ہو جاتا ہے۔ آخر کار وہ شہزادے کو ایک کنویں میں قید کر دیتی ہے۔

وزیر زادی نجم النسا اس مثنوی کا سب سے جاندار اور جیتا جاگتا کردار ہے۔ اس کا تعارف اس طرح کرایا جاتا ہے ــــ

تھی نجم النسا ایک دختِ وزیر نہایت حسین اور قیامت شریر

نجم النسا نہایت شوخ اور شریر ہونے کے ساتھ بہت ذہین اور باعمل بھی ہے۔ جب کہانی میں کوئی پیچ پڑتا ہے اسے سلجھانے کے لیے یہی سامنے آتی ہے۔ بدر منیر کے باغ میں جب شہزادہ شہزادی ایک دوسرے کو دیکھ کر غش کھا جاتے ہیں تو شہزادی کی سہیلیاں گھبرا جاتی ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کیا جائے۔ اس وقت ساری تدبیریں نجم النسا کو ہی سوجھتی ہیں۔ پری جب شہزادے کو کنویں میں قید کر دیتی ہے تو کہانی رک سی جاتی ہے۔ اس وقت نجم النسا کی دلیری کام آتی ہے۔ وہ جوگن بن کے شہزادے کی تلاش میں نکلتی ہے اور آخر کار اسے ڈھونڈ نکالتی ہے۔ وہ ہمدردی، ایثار، جرأت مندی اور حسنِ تدبیر کا مجسمہ ہے۔

مثنوی میں چند چھوٹے چھوٹے کردار بھی ہیں مثلاً بادشاہ، ملکہ، کنیزیں، جنوں کا بادشاہ، جنوں کا شہزادہ۔ مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ اس زمانے میں کردار نگاری کا جو تصور تھا اسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ میر حسن میں جتنی صلاحیت تھی اس سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے اور کردار دلچسپ انداز سے پیش کیے گئے ہیں اور ان کی جذبات نگاری کا بڑی حد تک حق ادا کر دیا گیا ہے۔

مثنوی کی زبان : میر حسن کے خاندان میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ان کے والد بھی شاعر تھے اور دبستانِ دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں رہائش کے باوجود میر حسن خود کو دبستانِ دہلی سے وابستہ خیال کرتے تھے اور انھیں اس پر فخر تھا۔ مثنوی کی زبان پر غور کیجیے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ زبان کے معاملے میں لکھنؤ کی نہیں بلکہ دہلی کی پیروی کرتے ہیں۔ زبانِ دہلی کی سادگی، روانی اور سلاست مثنوی سحرالبیان کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے وہ ہمیشہ اپنا دامن بچاتے ہیں۔ محاورے اور روزمرہ کی صحت کا بھی انھوں نے بہت خیال رکھا ہے۔ زبان کی شستگی اور شعریت بھی ملحوظِ خاطر رہی ہے۔

میر حسن کے استعارے اور تشبیہیں دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ بھی ہوتی ہیں۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی انھوں نے بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔ اسی لیے مثنوی میں ایسے الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں جن کا استعمال آگے چل کر ترک ہو گیا۔ مثنوی سحرالبیان کی اسی خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے :۔

"اس کی فصاحت کے کانوں میں قدرت نے کیسی سناوٹ رکھی تھی کیا اٹے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ اس وقت کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آج ہم تم بول رہے ہیں۔"

—— آبِ حیات

مثنوی میں ایسے اشعار بھی کم نہیں جو زبان زد ہو گئے ہیں یعنی لوگوں کی زبان پر اس طرح چڑھ گئے ہیں کہ آج تک حسبِ موقع استعمال کیے جاتے ہیں۔ دو ایک مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں ——

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

✳

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

✳

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن جوانی کی راتیں امنگوں کے دن

مثنوی کی چند دلکش تشبیہیں ملاحظہ فرمائیے ——

وہ اجلا سا میداں چمکتی سی ریت اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

✳

وہ گورا بدن اور وہ بال اس کے تر کہے تو کہ ساون کے شام و سحر

لٹیں منہ پہ چھوٹی ہوئی سر بسر کہ بدلی ہو جوں مہ کے ادھر ادھر

مثنوی کی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے مکالموں کے بارے میں بھی یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ مکالمے نہایت برمحل ہیں۔ جس کردار کی زبان سے جو مکالمے ادا ہوئے ہیں وہاں یہ لحاظ ضرور رکھا گیا ہے کہ اس کے مناسبِ حال ہی الفاظ و محاورات استعمال کیے جائیں۔ مثلاً نجومی اور پنڈت گفتگو کرتے ہیں تو اپنی مخصوص زبان میں۔ دیکھیے ——

کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار تو کچھ انگلیوں پر کیا پھر شمار

جنم پترا شاہ کا دیکھ کر تلا اور برچھیک پر کر نظر

کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا چندرماں سا بالک ترے ہوئے گا

کلیم الدین احمد جو اپنی سخت گیری کے لیے مشہور ہیں اور اردو شاعری کو خاطر میں نہیں لاتے، مثنوی سحرالبیان کے طرزِ ادا کے قائل نظر آتے ہیں۔ مثنوی کے اسلوبِ نگارش کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"اہم ترین چیز سحرالبیان میں طرزِ ادا ہے۔ عبارت صاف، پاکیزہ اور بامحاورہ ہے۔ بیان سراسر شوخ اور دل پذیر ہے۔ شیرینی اور ترنم کی کمی نہیں، عموماً الفاظ نرم اور نہایت ملائم استعمال ہوئے ہیں.... میر حسن نے فصیح روزمرہ کا نچوڑ اس مثنوی میں رکھ دیا ہے۔ گفتگو اور مکالمے کے لطیف ترین پھول یہاں کھلتے ہیں۔ جملہ خوبیوں کے ساتھ کہیں ضرورت سے زیادہ تصنع کا پتا نہیں۔"

——— اردو شاعری پر ایک نظر

مثنوی سحرالبیان میں دو ایک خامیاں بھی ہیں۔ مثلاً طوالت کا عیب کھٹکتا ہے۔ میر حسن نے تقریباً ہر بیان کو طول دیا ہے جو اکثر جگہ ناگوار ہوتا ہے۔ فوق فطری عناصر کی بھرمار نہیں لیکن دیو، پری، کل کا گھوڑا، متعدد ایسی چیزیں ہیں جنھیں عقل تسلیم نہیں کرتی۔ کہانی میں کوئی انوکھا پن نہیں۔ اس کے باوجود سحرالبیان کی خوبیاں اس کی خامیوں پر بھاری ہیں۔ یہاں میر حسن کا جمالیاتی شعور اور ان کی فنی مہارت کا قدم قدم پر ثبوت ملتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ میر حسن نے عریانی اور فحش نگاری سے دامن بچایا ہے حالانکہ یہاں اس کے متعدد مواقع موجود تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس مثنوی کے محاسن کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے :۔

"واقعہ یہ ہے کہ اس تصنیف میں میر حسن نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے، اپنی ذہانت و فطانت، فنی آگہی و لسانی شعور کا ثبوت اس مثنوی کے ہر ہر مصرعے سے فراہم کیا ہے۔ یہ کہانی نہیں تہذیبی دستاویز ہے۔ یہ "شعر محض" نہیں صحیفۂ حیات ہے۔"

——— مضامینِ نو

اور میر حسن کا یہ دعوا درست ہے کہ ———

رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام
کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام!

✻ ✻